ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

غلام عباس کے افسانوں میں سماجی شعور کے مختلف مظاہر

Various Manifestations of Social Consciousness in Ghulam Abbas's Short Stories

1.**Dr. Parveen Kallu,** Associate Professor Urdu Department , Government College University Faisalabad. drparveenkallu@gcuf.edu.pk

2.**Farkhanda,** MPhil (Urdu) Urdu Department Hazara Univetsity Mansehra.

3.Dr. Nazia Sahar, Assistant Professor, Urdu Department Islamia College Peshawar.

Abstract

The concept of human's social role is prominent in every fiction writer in one form or another. The essence of this theory is that man is always playing his artificial role in his real life like an actor in a stage play. Actually, the mental and psychological motivation of this performance is the socio-class and economic consciousness of a person, because the consciousness of a person changes gradually in different situations of collective life. Therefore, in different times and places, there are unconscious changes in the outward behavior of a person. In view of this concept, all human beings deserve to be called skilled actors in their lives. But an unexpected result of this continuous acting is that man has forgotten his reality while living an artificial life. Ghulam Abbas was a noble person. Reading and writing and being quietly engaged in one's work was his life's skill. He was busy with his work; he was not interested in grouping. This is the reason why he gave the Urdu language stories that will live forever. His short stories include Anandi, Katba, Jawari, Overkot, Saya, Kun Ras and Hammam Mein..

Key Words: Ghulam Abbas, Various Manifestations of Social Consciousness, artificial role, socio-class, noble person, Anandi, Katba, Jawari, Overkot, Saya, Kun Ras and Hammam Mein.

غلام عباس کے افسانوں میں بھی سماجی رول کے تصور کے متعلق کئی شواہد جا بجا نظر آتے ہیں۔مثلاً کن رس میں ایک جگہ استاد حیدری خان کی شخصی تبدیلیوں کے متعلق اس انداز میں قلم بند کیا گیا ہے:

"سب سے پہلے فیاض کو حیدری خاں کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی۔حیدری خاں بہتیر امنع کرتا رہا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔اس نے حیدری خاں کے لئے ایک نیا جوڑا سلوایا۔اس کے پاس بڑھیا سیاہ کپڑے کی شیروانی تھی جسے وہ کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا۔یہ شیروانی دو ایک جگہ سے مسلک تو گئی تھی مگر ابھی اچھی حالت میں تھی۔وہ اسے ایک درزی کے پاس لے گیا اور اس میں قطع و برید کرا کے اسے خاں صاحب کے ناپ کا بنوایا۔پھر اس نے خاں صاحب کی ترکی توپی کو دھلوا کے اس میں نیا پھندنا لگوایا۔اس نے خاں صاحب کے لئے ایک مضبوط سا جوتا بھی خریدا۔پھر ان سب چیزوں کو ایک سوٹ کیس میں رکھ ، خاں صاحب کو ساتھ لے ایک حمام میں پہنچا۔وہاں پہلے تو خاں صاحب کے پٹوں کو مختصر کرایا۔داڑھی منڈوائی ، مونچھوں کو تر شوایا ، ناخن کٹوائے ، پھر حمام والے سے دو تین مرتبہ حمام میں پانی بھروا کے اسے خوب نہلوایا، اس کے کپڑے بدلوائے ، جس وقت حیدری خاں حمام سے نکلا تو وہ ایک اچھا خاصا معقول انسان نظر آنے لگا۔اس وقت دو پہر ہو چکی تھی ، ظہر کا وقت قریب تھا۔دونوں گھر واپس آرہے تھے کہ راستے میں ایک مسجد نظر آئی۔حیدری خاں وہیں ٹھہر گیا۔اس نے بڑی رقت بھری آواز میں فیاض سے کہا:

فیاض بیٹے۔آج بڑی مدت کے بعد پاک صاف ہوا ہوں اور کپڑے بھی پاک ہیں۔میرا جی چاہتا ہے کہ آج اپنے مولا کے سامنے سر جھکا لوں۔" فیاض کو کچھ تعجب تو ہوا مگر اس

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

نے خاں صاحب کی خواہش کو رد نہ کیا اور وہ دونوں دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئے۔تھوڑی دیر کے بعد جب حیدری خاں مسجد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے طور طریقے بھی ایک دم بدل گئے۔اس کی زبان سے وہ بات بات پر دعائیہ کلمات کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے بجائے اس کے اندازِ تخاطب میں ایک تحکم پایا جانے لگا۔جس وقت فیاض اس کے ہمراہ بازار سے گزر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مؤدب شاگرد استاد کے ساتھ ساتھ جارہا ہو"(۱)

غلام عباس نے زندگی کو ایک حقیقی روپ میں دیکھا پھر اس پر لکھنا شروع کیا۔

"غلام عباس ہمارے وہ افسانہ نگار تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔وہ دھیمے مزاج کے انسان تھے۔یہی دھیما پن ان کی کہانیوں کا مزاج ہے۔غلام عباس نے مسابقی افسانے نہیں لکھے بلکہ انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔اس لئے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی نہیں کھوتے بلکہ اسی طرح تروتازہ زندہ رہتے ہیں۔"(۲)

موضوعاتی سطح پر غلام عباس کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یوں پتا چلتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو طنز اور فریب سمجھا ہے۔زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتے ہیں اور اس میں سے طنز کو دیکھتے اور اس طنز کوالفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔غلام عباس حقیقت نگار تھے ان کی حقیقت نگاری ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔اردو ادب میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے تلخ حقیقت کا بیان کیا ہے۔غلام عباس کی حقیقت نگاری ترقی پسند تحریک سے ہٹ کر ہے۔انہوں نے کہیں بھی اپنی حقیقت نگاری کی نہ وضاحت پیش کی ہے نہ ہی اُس کا دفاع کیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اُنہی مشاہدات تجربات کو جگہ دی ہے جو عام انسان محسوس کرسکتا ہے۔اس حوالے سے ان کا افسانہ "بہروپیا"اہم ہے۔یہ افسانہ پڑھ کر قاری الجھن کا شکار نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ حقیقت نگاری پر لکھا گیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"اسلم آؤاس بہروپیے کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں رہتا ہے اس کا گھر کیسا ہے اس کا کوئی نہ کوئی میک اپ روم تو ہو گا ہی شاید اسی تک ہماری رسائی ہو جائے۔پھر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی اصلیت میں کیسا لگتا ہے۔"(۳)

حقیقت نگاری سے عام طور پر معاشرتی یا سماجی حقیقت نگاری مراد لیا جاتا ہے۔غلام عباس کو ان رویوں میں تقسیم کرنے کی بجائے سادہ حقیقت نگار کہنا بہتر ہوگا۔غلام عباس کے افسانے معاشرتی اور نفسیاتی حقیقت کے زمرے میں آتے ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے "چکر" کے عنوان سے افسانہ لکھا۔اس افسانے میں ایک شخص معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کی جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔پیٹ بھرنے کے لیے اسے دن بھر بے لگام محنت کرنی پڑتی ہے۔اس کے باوجود نہ اُس کی ضرورت پوری ہوتی ہیں نہ آسودگی ملتی ہے۔چیلا رام کے ذریعےلاحاصل محنت اور نفسیات کا بیان غلام عباس کی نفسیاتی حقیقت نگاری کی طرف اشارہ ہے۔س جس طرح غریب آدمی خواہشات کی چکی میں پستا چلا جاتا ہے۔اور دن بدن غربت بھی بڑھتی جاتی ہیں اور زندہ رہنے کی آرزو بھی ختم ہو جاتی ہے اسی نفسیات کا بیان غلام عباس کے ہاں ملتا ہے۔افسانے میں غلام عباس یوں بیان کرتے ہیں:

اس کی بیوی نے کوٹھری میں چلا کر کہا بھوجن کر لو۔چیلارام نے کچھ جواب نہ دیا آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا:

"بھوجن کبھی کا تیار ہو چکا ہے اب اندر آجاؤ نہ! وہ کیا سوچ رہا تھا کیا وہ اس کے مسلے پر غورکر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہوں۔"(۴)

غلام عباس کے افسانوں میں معاشرتی حقیقت نگاری کھل کر سامنے آتی ہے۔نچلا اور متوسط طبقہ معاشرتی محرومیوں کے باعث اپنی خواہشات اپنے سینے میں دفن کرکے قبر میں چلا جاتا ہے۔اس طبقے می محرومی اس کے نفسیاتی بحران کو جنم دیتی ہے۔اس کشمکش میں انسان سوچتا ہے کہ وہ دنیا میں کیوں آیا یا دنیا میں آنےکااس کا مقصد کیا تھا۔اس حقیقت نگاری پر غلام عباس کا لکھا گیا افسانہ" کتبہ""ہم ہے۔شریف حسین کے ذریعے انہوں نے متوسط طبقے کی حقیقت کا نقشہ کھینچا ہے۔شریف حسین جب سنگ مر مر کے ٹکڑے پر جب اپنا نام کُھدا ہوا دیکھتا ہےاور سنگ تراش سے وہ کتبہ لے کر چلتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کو غلام عباس نے الفاظ کے ذریعے گرفت میں لے لیا ہے۔غربت صرف انفرادی بلکہ اجتماعی مسئلہ ہے۔یہ واحد حقیقت ہے جو انسان کے اندر احساس پیدا کر دیتی ہے۔ زندگی انجانے گناہوں کا نتیجہ دکھائی دینے لگتی ہے۔اسی وجہ سے ایک فرد دوسرے جان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"اسے سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کُھدا ہوا دیکھ کراسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سےاس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا۔"(۵)

انسان کے اندر ایک انسان تلاش کرنا غلام عباس کا پسندیدہ طریقہ کار ہے۔اُن کے بیشتر افسانوں میں یہی انداز نمایاں ہے۔انسانی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ہر انسان کا ایک ظاہر ہوتا ہے ایک باطن ہوتا ہے۔غلام عباس کے افسانے "کن رس""میں بھی ایک نئے انسان کی تلاش کا عمل سامنے آتا ہے۔اس افسانے کا بنیادی کردار فیاض کا ہے جو بہت شریف اور اپنے طبقے سے محبت رکھنے والا ہے۔اس افسانے میں انسانیت کی تذلیل بھی کی گئی ہے۔وہ یہ ہے کہ افسانے میں ایک ہنستے کنبے کو زوال پذیر ہونا پڑتا ہے۔فیاض کے کنبے کا بازارِ حسن میں آجانا دراصل نئے انسان کی جستجو ہے۔غلام عباس کے افسانے میں قاری کو انجام پر چونکا دیا ہے۔غلام عباس نے افسانے میں انسان کے باطن کی رمزیں تہہ در تہہ دریافت کیں اور اچھے خاصے انسان کی روح عریاں کرکے ہمارے سامنے پیش کر دی۔

"فیاض اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آتا تھا اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی۔لوگ آتے جاتے تھے اور گائیوں تکیوں سے لگ بھگ بیٹھتے جاتے تھے۔یکبارگی طبلہ پرتھاپ پڑی اور غیرت نائیدادپہلی پشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی اورمرث کرنے لگی۔ہاتھ پاؤں کی چلت پھرت اس غضب کی تھی کہ ہر ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل مسلے جاتے۔"(٦)

ہمارا معاشرتی نظام ایسا ہے کہ جہاں انسان مجبور ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ اس کی مدد کی جائے لوگ صرف تماشہ دیکھتے ہیں۔ محرومیوں کی آنکھ میں جھونک دینے کے بعد بھی سماج کے مکار کھلاڑی سادہ اور معصوم لوگوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے اور اُن کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچوانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔غلام عباس نے اس موضوع کو "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" میں کھل کر بیان کیا۔غلام عباس خیر کا روپ ڈھال کر شر کی آلودگی پھیلانے والے منشی جیسے سماجی سرطانوں کی بڑی عمدگی سے تشخیص کرتے ہیں۔اپنے انداز بیان سے وہ استحصالی طبقہ کی جابرانہ سوچ کو ختم کرتے ہیں۔اسی افسانے کے کرداروں میں چار حجام ہوتے ہیں جو دکھنے میں باشعور ہوتے ہیں لیکن اندر سے وہ عیار ہوتے ہیں۔لیکن اس افسانے میں منشی کا کردار ایسا کردار ہے جو ان حجام کا مہارت اور سماجی عیاری سے ان کا استحصال کرتا ہے۔منشی ایسے محسوس کرواتا ہے کہ گویا وہ ان پر رحم کر رہا ہوں لیکن وہ ان کا استحصال کر رہا ہوتا ہے اور وہ با آسانی سے اس کی اطاعت کر لیتے ہیں۔وہ ان کو ایسا فریب دیتا ہے کہ وہ دربدر بھٹک جاتے ہیں۔غلام عباس نے یوں لکھا اقتباس ملاحظہ ہو:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

”منشی نے جواب دیا”گستاخی معاف میں آپ کو زیادہ سے زیادہ اسی روپے دے سکتا ہوں دوسرے نمبر والے کو ساٹھ ، تیسرے نمبر والے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔اگر آپ لوگ یہ تنخواہ منظور کریں تو ابھی جاکر چاہے مجھے دُگنے تگنے سود پر قرض لینا پڑے آپ سب کے لئے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لیے لاتا ہوں اوروعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو ہر مہینے پیشگی تنخواہ ملا کر گی۔یاد رکھو میرے دوستوں یہ تنخواہ کسی بڑے ہیئر کٹنگ سیلون کی تنخواہ سے کم نہیں ہے آپ لوگ خود جا کر دریافت کر سکتے ہیں۔“(۷)

غلام عباس کا افسانہ سماجی مظالم کے خلاف ایک بھرپور احتجاج ہے۔جسے پوری شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔اُن کی ایک بات واضح ہے کہ طاقت ہی اس سماج کی سب سے بڑی سچائی ہے۔مظلوم لوگ انصاف کی عدالت میں صرف اور صرف اپنی عزت کا ہی تحفظ چاہتے ہیں۔لیکن سماج کے جابر لوگ ان کی عزت کا تحفظ نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ مظلوم طبقہ ظلم کی چکی میں پستی چلا جاتا ہےاوروہ کانٹوں کو اپنے پاؤں کے چھالوں کا رس پلاتے ہیں۔اس موضوع کے حوالے سے غلام عباس نے ”بردہ فروش“ لکھا۔اس افسانے میں ریشماں کا کردار درد کے کرب میں مبتلا کردار ہے۔مائی جمی کا کردار سماج کی طاقت کو بیان کرتا ہے۔اس افسانے میں سماج کے ظلم کی عکاسی کی جاتی ہے کس طرح عورت سماج میں بکتی ہے۔عورت اس سماج میں ماں، بہن، بیٹی سے ہٹ کر طوائف ،لونڈی،فاحشہ کے ادب میں بھی موجود ہے۔عورت کے اس ادب کی عکاسی غلام عباس نے خوبصورت انداز میں کی۔اقتباس ملاحظہ ہو:

”تو چوہدری آؤ نہ پہلے کیوں نہ اسی کا قصّہ پاک کریں۔ہم بھی کیسے بےوقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جانیں دیتے ہیں۔اس کا کیا پتا کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہوگی۔“
(۸)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ دو لوگ خود کو سارے گناہوں سے بری الزماں ہو کر تمام الزامات فاحشہ ریشمہ پر ڈال دیتے ہیں۔لفظ فاحشہ میں عورت کے کردار پر گہراطنز کیا گیا ہے۔غلام عباس ایسے گناہ کرنے والے کے اصلی روپ زمانے کے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں۔غلام عباس کے افسانوں میں مجبور طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔اور لوگوں پر حقیقت واضح کرتے ہیں کہ جرم کرنے والے آزادہیں اور مجبور طبقہ ساری عمر کیے گئے گناہوں کا ازالہ کرتے زندگی گزار دیتا ہے۔سماجی بہروپ بھی غلام عباس کے افسانوں کا بنیادی موضوع رہا ہے اس حوالے سے ان کا افسانہ“ اور کوٹ“اہم ہے۔افسانے کی تمام محض خوبیاں اس میں موجود نہیں ہیں۔زندگی سے متعلق ہر طرح کی بصیرت اس افسانے میں ملتی ہے۔اوور کورٹ بظاہر ایک سیدھا سادہ سا بیانیہ ہے۔اور کوٹ سماجی بہروپ کی علامت ہے۔سماج میں انسان کی شناخت مصنوعی چہروں کی وجہ سے مشہور ہو چکی ہے۔ہمارے سماج کا یہ المیہ ہے کہ ہم ظاہر دیکھتے ہیں باطن میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتے۔جب ظاہری خول انسانی چہروں سے ہٹ جاتا ہے تو ہم خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں۔اس افسانے کا بنیادی کردار ایک نوجوان ہے جو دیکھنے میں خوبصورت ہےلیکن جب حادثے میں اس کی موت ہوتی ہے تو اس کا اصل چہرہ سماج کے سامنے آ جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

”نوجوان کے گلو بند کا لر کیا سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جابجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ میلا کچیلا بنیان نظر آرہا تھا۔نوجوان سلک کے گلوبند کواس ڈھب سے گلےپر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینوں سے نہیں نہایا تھا۔“(۹)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

ظاہریت کے اثرات انسان کی داخلیت میں بھی مرتب ہوتے ہیں۔جب تک وہ فقیر کے غلیظ وخبیث کپڑے پہنتا تھا تو اس کا رویہ بھی فقیرانہ تھا۔مگر ظاہر ا معقول اور صاف ستھرا لباس پہننے سے اس کے مزاج میں خود اعتمادی کا جذبہ اور رویوں میں استادانہ طور طریقہ پیدا ہوتا ہے۔ساتھ ہی استاد کے متغیر سلوکوں سے متاثر ہو کر فیاض بھی اس کے ساتھ سعادت مند شاگرد کی طرح پیش آنے لگتا ہے۔

اس طرح غلام عباس بھنور میں حاجی اور بہار کے تعلقات کے ذریعے ان کے معاشرتی و خانگی رول کے نامیاتی شعوروں کو نمودار کرتے ہیں۔حاجی نے ناگہاں سانحے کے باعث اپنے اہل وعیال کو گنوا دیا تھا۔وہ اب ایک طوائف بہار کو گھر میں پناہ دیتا ہے اور اس کا نام بلقیس بیگم میں بدلتا ہے۔چند ہی دنوں میں بلقیس اپنی خدمت گزاری وسعادت مندی سے حاجی کا پورا اعتماد حاصل کر لیتی ہے۔وہ شریف گھرانے کی لڑکی کے مانند نظریں نیچی کر کے اس کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتی ہے اور حاجی کو بھی اس سے پدرانہ الفت و محبت محسوس ہوتی ہے:

> ”چند ہی دنوں میں بہار نے ، جس کا نام حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلایا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدردان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ الفت ہوگئی جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام سے کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لئے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی کیوں کہ وہ یہ خوب سمجھتے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔“(۱۰)

معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس حاجی اور بلقیس دونوں کی ماضی و حال کی نفسیاتی تانے بانے کو ہو۔ خارجی سطح پر لا کر آپس میں مدغم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دو تماشے میں ایک انسان کے ظاہر و باطن کے تضادات کو فن کارانہ دانائی فکر انگیزی کے ساتھاجاگر کیا گیا ہے۔مرزا برجیس قدر طبعا شفیق و حلیم طبع انسان ہونے کے باوجود اپنے خاندانی وقار و عزت کی نمائش کے لئے لوگوں کے ساتھ رعب ود بد بہ اور ہتک آمیز سلوک سے پیش آتا ہے۔در اصل اپنے خاندانی تنزل کے خیال و احساس نے اس کے ظاہری رویوں میں سخت گیری اور نمائش پسندی کا اضافہ کر دیا ہے۔چنانچہ وہ غریبوں کے سامنے بے رحمانہ و تحکمانہ رول ادا کرنے کے باوجود دل ہی دل میں اپنی نا موافق و نازیبا حرکتوں کا محاسبہ کرتا ہے اور وہ خود اپنی اصلیت اور مصنوعی رول کے درمیان ذہنی کشمکش کے شکنجے میں پڑا رہتا ہے۔

سمجھوتا میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انتہائی مشکلات و مصائب میں انسان اپنے نفس کی حفاظت کے لئے خود فریبی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں ہیرو کی بیوی ایک دن گھر سے بھاگ نکلتی ہے۔چند دنوں تک مرکزی کردار اپنے دوست و عزیز کے سامنے اپنی عزتِ نفس کی خاطر خاموشی و بردباری اختیار کر لیتا ہے۔مگر اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں اور مسرتوں کو یاد کرتے ہوئے وہ بہت جلد ذہنی و نفسیاتی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔وہ اپنے نفس کو شدت غم اور تحقیر واذیت کے احساس سے محفوظ کرنے کے لئے گردو پیش کے حقائق سے منہ پھیر لیتا ہے۔چنانچہ جب اس کا نفسیاتی تناؤ کشمکش حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو وہ عیاش کا نقاب پہن کر نہایت اشتیاق وانہاک کے ساتھ بازار حسن کا چکر لگانے لگتا ہے:

> ”اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔پہلے پہل اسے اس کو چے میں جانے کے لئے دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر چند ہی روز بعد دوست اسے اپنی راہ میں حائل معلوم ہونے لگے۔چنانچہ وہ اکیلا ہی شب گردی کے لئے نکلنے لگا۔پہلے گھوم پھر کر ساری منڈی کا جائزہ لیتا ، مال کو پر کھتا اور پھر اپنا پسند کیا ہوا

دانہ ایک شوقین مزاج رئیس زادے کی طرح منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ دفتر سے اٹھ کر شاذ ہی کبھی گھر پہنچتا۔آج اس کو ٹھے پر ہے تو کل اس بالا خانے پر ، جھوٹی محبتیں جتاتا اور خود بھی جھوٹی محبتوں سے لطف اٹھاتا۔ اگلے روز یہ باتیں خواب کی طرح معلوم ہوتیں۔نئی رات آتی تو نئے سرے سے حسن و عشق کی دنیا بسانے کی دھن پھر سوار ہو جاتی۔اس نے اپنا یہ اصول بنالیا تھا کہ عورت سے تعلق محض وقتی اور کاروباری ہونا چاہیے اور دوسرے سودوں کی طرح اس میں بھی ہر طرح کا دروغ جائزہے۔"(۱۱)

جب اس کی بیوی گھر لوٹ آتی ہے تو پہلے پہل وہ اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے پرواہی سے پیش آتا ہے۔مگر آئے دن کی عیاشی وبے راہ و روی سے پیسوں کی قلت ہوتی ہے تو اس کا دل از سرنو اپنی بیوی کی خوش نمائی و دل فریبی کی طرف راغب ہوتا ہے:

"یہ سچ سہی کہ میری بیوی با عصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہو گیا اور جن سے ملنے کے لئے میں آج بھی تڑپتا رہا ہوں۔"(۱۲)

ہر چند کہ وہ پھر سے ازدواجی زندگی میں قدم رکھ دیتا ہے، لیکن وہ اپنے اقدام کو محض جنسی و فاحشانہ تکمیل اور تسکین سے ہی ہمکنار کر لیتا ہے اور وہ آخر تک اپنے ڈرامائی نقاب کو اتارنے سے قاصر رہتا ہے۔

کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اصلیت کو زمانے سے چھپانے کے لئے جھوٹا نقاب پہن کر زندگی گزارنے پر مجبور رہتا ہے۔" فرار میں سرفراز اپنی حساس مزاجی و سنجیدہ مزاجی کو چھپانے کے لئے لوگوں کے سامنے خود کو خوش خلق و ملنسار اور ظرافت پسند انسان کے روپ میں دکھاتا ہے۔لیکن بستر مرگ میں اس کی فطرت سخت مزاجی و تنہائی پسندی کی صورت میں نمود ہوتی ہے۔

عموماً غلام عباس کی تخلیقات میں انسان کی سماجی اداکاری کے تصور کو غیر واضح طریقہ کار میں پیش کیا گیا ہے۔لیکن انھوں نے خاص کر دو افسانوں میں اس موضوع کو بدیہی پیرایوں میں بیان کرنے کے لئے افسانے کے ماحول کو ڈرامے کے اسٹیج کے طور پر، اور کرداروں کو اداکاروں کی طرز پر پیش کیا ہے۔ان دو افسانوں کے نام ہیں کہ اوور کوٹ اور اس کی بیوی"۔اوورکوٹ میں اوورکوٹ کا نوجوان سرمایا دارانہ نظام کے ظلم و جبر کو متواتر سہنے کے رد عمل میں زمانے کے سامنے تن تنہا اپنا جھوٹا رول ادا کر دیتا ہے۔اصل میں وہ ایک مفلس وغریب انسان ہے۔مگر وہ میلے کچیلے بنیان اور بوسیدہ سویٹر کے اوپر عمدہ ونفیس اوور کوٹ پہن کر خود کو امیر انسان دکھانے کی سعی کرتا ہے۔

"ملکہ کے بُت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات وسکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہوگئی۔اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا تا کہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔بُت کے آس پاس کے لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے ، وہ رک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔بچے کچھ دیر تو اس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے۔مگر جب وہ سکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔"(۱۳)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

یقیناً شہر کے پر رونق ماحول کے اثرات ہیرو کے ناٹک پر اثر انگیز ہوتے ہیں۔نوجوان یہاں ذہنی مطابقت و موافقت کے مظاہرے کے ذریعے انگریز بچے اور اس کے کھیل کود سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یوں تو نوجوان شہر کی طرب انگیز وفرحت بخش فضاؤں اور تمام راہگیروں سے متاثر ہوتے ہوئے چہل قدمی کرتا جاتا ہے:

"ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا

نوجوان نے آواز دی۔

پان والا!

"جناب!" وس کا چینج ہے؟،،

ہے تو نہیں۔لا دوں گا۔کیا لیں گے اپ؟

نوٹ لے کے بھاگ گیا تو ؟"

جی واہ کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟

نہیں نہیں۔ ہم خود چینج لائے گا۔و یہ اکنی نکل آئی۔ایک سگرٹ دے دو اور چلے جاؤ۔"(۱۴)

وہ عارضی و وقتی طور پر اپنی کڑوی زندگی کو بھلانے کے لئے بہروپ دھارتا ہے۔احساسِ برتری کے نشے میں مزید چور ہونے کے لئے وہ غرباء کی عزت و حرمت سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔پان والے کے مانند شہر کے تمام لوگ اوور کوٹ کے نو جوان کے سامنے ضمنی کرداروں کی حیثیت سے رول ادا کرتے ہیں اور ان کا وجود نوجوان کی ادا کاری کی تکمیل کے لئے لازمی(dispensable) ہے :

"اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح مٹر گشت کرتا ہوا جلد چل جارہا تھا۔ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور کو چوان، پھل بیچنے والے، جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے۔کچھ راہگیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گدا گر۔یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے کیوں کہ وہ غل غپاڑہ نہیں مچارہے تھے بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔نوجوان پل بھر کے لئے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔"(۱۵)

غلام عباس نے اپنے افسانوں میں کہانی کے مرکزی موضوع سے ہٹ کر کوئی بات اٹھا نہیں رکھی ہے۔اس افسانے میں وہ موثر و مدلل ڈھنگ سے سماج کے دو متضاد و منقسم طبقوں کے تلخ حقائق کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ان کے خیال میں ایک طبقہ وہ ہے جو غرباء کا خون چوس کر اس ظاہری رونق میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔دوسرا طبقہ غرباء کا ہے جو دنیا کی چمک دمک کو امیروں تک پہنچانے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔غریب لوگ رستوران کے باہر کھڑے ہوکر چند لمحوں کے لئے امیروں کے ذوق و شوق سے مسرور و پر کیف ہوتے ہیں۔اوور کوٹ کا لڑکا اب امیر زادے کا رول ادا کر رہا ہے۔اسی لئے اسے اپنی عزت نفس کے مارے ان لوگوں کے ساتھ میوزک سننا گوارا نہیں۔اس کے اگلے سین (Scene) میں اس کا انگریزی موسیقی کی دکان میں بلا تکلف

قدم رکھنا اس نفسیاتی ردعمل کا نتیجہ ہے۔غلام عباس کے دور میں خصوصاً بٹوارے سے قبل امرا وغرباء دوطبقوں کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔عوام کو خود کوسجا سنوار کر باہر گھومنے پھرنے کی استعداد مطلق نہ تھی۔مگر ہمارے دور میں، یعنی اکیسویں صدی کے ہندوستان میں متوسط طبقے کے لوگوں میں چھٹی کے دن اپنے آپ کو سنوار کر Window Shopping کرنے کا چلن عام ہو چکا ہے۔چنانچہ اوور کوٹ کی کہانی غلام عباس کے دور کے سماجی نقطۂ نظر کے لحاظ سے غیر حقیقی و نا قابل یقین ہونے کے باوجود اس کے مرکزی کردار میں ہمارے زمانے کے نوجوانوں کی سی خصوصیت صاف جھلتی ہے۔اس کے سبب اس کردار کا انوکھا پن ہماری نگاہوں میں کسی قدر ماند پڑے ہوئے دکھائی دیتا ہے:

"اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کو ڈرائے کی پتلون اور نپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید سائن کی گھیر دار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔وہ بھاری بھر کم سی تھی۔اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔نوجوان کے لئے جواب ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، یہ نظارہ خاصا جاذب نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

ہر گز نہیں ، ہر گز نہیں ، ہر گز نہیں۔"

"سنو میرا کہنا مانو لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا۔" ڈاکٹر میرا دوست ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

نہیں نہیں نہیں۔"

میں کہتا ہوں تمھیں ذرا تکلیف نہ ہوگی۔"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔"

"چپ رہو۔ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔مگر اس دلچسپ جوڑے نے ، جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی ہی ادا تھی، جیسے یک بارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے "۔(۱۶)

جوڑے کے ادا کارانہ مکالموں سے نو جوان بے ساختہ متاثر ہوتا ہے، حالاں کہ ان کی گفتگو میں حقیقی زندگی کا جو رنگ و بو جھلکتا ہے وہ قطعا اس مصنوعی و ڈرامائی فضاؤں سے موافقت نہیں رکھتا ہے۔جوڑے کے مکالموں سے مردوزن دونوں کے فطری واز لی رشتے بے نقاب دکھائی دیتے ہیں مگر ان دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے دفعتاً ایک لاری سے مرکزی کردار کا حادثہ ہو جاتا ہے اور اسے ہسپتال کے شعبہ حادثات میں پہنچا دیا جاتا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

"اپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے، اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔"(۱۷)

مصنف علامتاً ڈاکٹر اور نرسوں کے نقابوں سے قارئین کے سامنے اس حقیقت کو اجاگر کر دیتے ہیں کہ گرچہ انسان ایک دوسرے کی ظاہری صورت اور اطوار و اقوال کو اس کی مکمل شخصیت کا آئینہ دار سمجھتا ہے، مگر اس کی رسائی کسی دوسرے انسان کی اصلیت تک کبھی نہیں ہوتی ہے۔

اس کی بیوی میں غلام عباس نے ایک طوائف کی خوابیدہ فطرت و جبلت کو بیدار ہوتے ہوئے اور اسے اس بیداری کے نتیجے میں اپنی سماجی اداکاری سے فائق و بالاتر ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔اس کی بیوی ایک نوجوان لڑکا اور ایک طوائف نسرین کی کہانی ہے۔کہانی کے بیشتر واقعات نسرین کے کوٹھے کے اندر ہی واقع ہوتے ہیں۔غلام عباس نے شعوری و ارادی طور پر ڈرامہ نگاری کے عناصر سے افسانے کی فضا بندی کی ہے اور اس متعین و مقرر مقام میں کرداروں کے معاشرتی شعور و احساس اور داخلی کشمکش کو کھل کر ظاہر کیا ہے۔ایک نو جوان لڑکا ،نسرین کے کوٹھے میں گاہک کی حیثیت سے قدم رکھتا ہے۔لڑکا اس لئے یہاں آیا ہے کہ نسرین شکل وصورت میں اس کی مرحومہ بیوی نجمہ سے ملتی ہے۔دورانِ گفتگو وہ نسرین کو اپنی بیوی کی یادیں ہی سناتا ہے اور وہ نجمہ کی عادات و خصائل اور اپنی ازدواجی زندگی کے تمام اہم واقعات سے اسے روشناس کرا دیتا ہے۔خلاف توقع کو ٹھے میں ایک گاہک کی زبان سے اس کی بیوی کی متواتر تعریفیں سننے سے نسرین کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور اس کی پریشانی طنز و تشنیع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

"میری بیوی۔۔۔۔"

تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحب سے۔' بالآخر نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔"بے حد بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا۔وہ اس کے طعن کو نہیں سمجھ سکا تھا۔دد مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔ایک انتقامی جذ بہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے میں رفو چکر ہوگئی ، اور اب۔۔۔
وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی ، کیونکہ نو جوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔وہ کچھ دیر گم سم رہا۔پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اٹھا کر ، جن میں مجر بانہ گھبراہٹ یا گناہگارانہ ندامت کی کوئی علامت نہ تھی ،نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا۔پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔اس کے ہونٹ پل بھر کولر زے، مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔"(۱۸)

پھر بھی لڑکے کی بھولی بھالی صورت اور شریفانہ رویوں سے رفتہ رفتہ نسرین کا دل متاثر ہوتا ہے اور آخر کا ر بے ساختہ اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلتا ہے:

"بیگم صاحب کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟ یہ سوال کر کے وہ خود حیران ہو گئی۔ نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجہ میں کہنا شروع کیا: نہیں ، شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے مگر میں زیادہ دن اس فریب میں نہ رہ سکا۔میں بیمار پڑ گیا۔مہینہ بھر چار پائی پر پڑا رہا۔جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی تو امی جان اور زہری ، یہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے، میرے

سرہانے آکر کھڑی ہو جاتی اور ایسی چپ چپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں
کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا اور چاہتا کہ نہ مروں .. بس پھر میں رفتہ رفتہ
تندرست ہوتا گیا۔"(۱۹)

اس اثنا میں نسرین خود بخود اپنی ذات میں نجمہ کا عکس ڈھونڈنے لگتی ہے۔دراصل لڑکے کی مرحومہ بیوی کی شخصیت و کردار نسرین کو دھیرے دھیرے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے:

"آپ نے کہا تھا۔اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلکنے لگی۔"میری شکل بیگم
صاحب سے ملتی جلتی ہے، بھلا کیا چیز ملتی ہے؟"
نوجوان نے پل بھر غور کیا۔
"سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں مجھی سے ملتی ہیں۔یہ کہتے کہتے اس کے ہونٹوں پر ہلکی
سی مسکراہٹ آگئی تھی مگر لہجے سے ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ویسی ہی سیاہ اور
گہری۔دوسرے نمبر پر ٹھوڑی، ویسی ہی پہلی اور تیسرے نمبر پر... چلیے بیٹھے بنائیے
نہیں۔"
"تمہارے بال تمہاری گردن
نوجوان کی فطری چونچالی تیزی سے بحال ہورہی تھی اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی
کہ اس سلسلہ میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔"(۲۰)

اس کے بعد غلام عباس قارئین کی نگاہوں کو نسرین کے تحت الشعور کی طرف رخ کرنے کے لئے انھیں اس کی کھوئی ہوئی ماضی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔آسمان میں ستاروں کو دیکھ کر بے اختیار نسرین کے دل میں اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے کی یادیں اٹھتی ہیں۔ یہاں ہیروئن کے شعور کی روکا ذکر اس کی ہونے والی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے:

"یہ قمری مہینے کی آخری راتوں کی ایک رات تھی۔آسمان صاف مگر تاریک سا تھا۔ستارے
اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔
نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔سب سے پہلے جب وہ ستاروں سے آشنا
ہوئی تھی ، اس کی عمر چار برس کی تھی۔ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔اس نے باپ
کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے
دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے۔اسی اسٹیشن پر لال ٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے تنگ
دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی
تھی اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر
ٹھہرے رہے مگر کوئی سواری نہ ملی۔آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔گٹھری بغل میں
ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔
یہ سفر بھی بہت لمبا تھا۔مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا
تھا۔ان کو دیکھ کر اس کا ڈرکم ہونے لگا تھا۔یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ
کر سوگئی۔آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر میں پایا۔وہ کئی دن تک روتی بلکتی
رہی مگر باپ کی صورت دیکھنا اسے پھر نصیب نہ ہوا... "(۲۱)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

بچپن میں ایک دن جب وہ جاگی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی عورت کے ساتھ پایا۔لیکن اب جب صبح ہوتی ہے تو وہ خود کو ایک شفاف و پاکدامن عورت کے روپ میں پا جاتی ہے: در صبح کو نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا یہ تھا کہ نو جوان اس کے بستر پر موجود نہیں ، اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا اور وہ کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔ جب پاؤ گھنٹہ گزرگیا اور نو جوان کہیں نظر نہ آیا تو اسے الجھن ہونے لگی ہشمن جھاڑو لیے کمرے میں آیا تو اس سے پوچھا:

"وہ رات والے بابو کہاں ہیں۔"

"چلے گئے۔"

چلے گئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

جی ہاں صبح ہی صبح، ہم سب سو رہے تھے۔دروازہ بھی کھلا ہی چھوڑ گئے۔"

"ویسے تو سب خیریت ہے نا؟"بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔"جی سب خیریت ہے۔شمن اس کا مطلب فورا سمجھ گیا تھا۔"میں نے اٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔"

اپنے شبہے کے گھٹیا پن پر اسے شرم آگئی مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال نے اس پر تسلط جما لیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔اس نے سوچا، رات اسے میرا طعنہ بر الگا۔ وہ بڑا حساس تھا۔اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا۔صبح ہوتے ہی چل دیا۔(۲۲)

لڑکے کی غیر موجودگی کے باعث نسرین کے دل میں بے چینی و بے قراری بڑھ جاتی ہے۔ایک لمحے کے لئے نوجوان پر چوری کا شک کرنے سے وہ اپنے تئیں نادم وشرمندہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ اب اسے اپنے پیشہ وارانہ نکتہ نظر سے سخت نفرت و عداوت ہو چکی ہے۔ اتنے میں لڑکا ، منڈی سے گوشت اور ترکاری لے کر آتا ہے۔وہ کل تک نسرین کی ذات میں نجمہ کی شخصیت و کردار کا عکس کھوج رہا تھا۔آج وہ اس کے ساتھ اصلی شوہر کے مانند پیش آتا ہے، کیوں کہ وہ نسرین کے ساتھ عارضی و وقتی رشتے کے ذریعے اپنی نا آسودگیوں اور محرومیوں کی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے۔لیکن نسرین کے اندر اب تک نجمہ کی طرح رہنے سے جھجک باقی ہے۔اسے دونوں کے بیچ میں کسی قدر غیرت و بیگانگی کا پردہ حائل ہوتے ہوئے محسوس ہورہا ہے۔چنانچہ وہ اپنی پھوپھی سے کہتی ہے:

"خبطی ہے پورا ، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا یشمن کو اس کے پاس بھیج دینا ہاتھ بٹاتا رہے گا۔میں ذرا نو بہار کے ہاں جاتی ہوں"(۲۳)

نسرین اپنے قلبی تغیرات کو پھوپھی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی ہے۔وہ ایک طوائف ہے اور اس کی مخصوص سوسائٹی میں ازدواجی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنا مضحکہ خیز سمجھا جاتا ہے۔

لیکن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پہلی بار وہ نوجوان سے اس کے متعلق استفسار کرتی ہے اور اپنائیت کا شعور اس کی غیرت کے حجاب کو یکسر چاک کر دیتا ہے۔یوں اس کا نفس مکمل طور پر طوائف کے کردار کے خول کو توڑ کر اپنی ابتدائی واولین روپ کی طرف لوٹ جاتا ہے:

"آپ نے کہا تھا۔نسرین نے کہا۔" آج کل آپ کسی دوست کے ہاں رہتے ہیں۔

"ہاں مجھی کے مرنے کے بعد میں نے امی جان اور ہرہ کو تو گاؤں بھیج دیا تھا اور خود ایک دوست کے ہاں اٹھ آیا تھا۔یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہے۔ہم دونوں مکان کے کرائے ، کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساجھی ہیں۔" اور آدھی تنخواہ آپ امی جان کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں ! مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ لوٹاتی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کے لئے کبھی نیا بوٹ خریدنے کے لئے۔

HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے ؟

دس برس بڑی پیاری بچی ہے۔

"اسکول جاتی ہے؟"

نہیں۔گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔سینا پرونا اسے دادی سکھاتی ہے۔اس نے ایک بکری پالی ہے۔دودھ ہی سفید۔ایک بھی کالا بال نہیں۔زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔کھیت سے بونٹ توڑ کر لاتی ہے۔اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے۔ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا وہ زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔پانی کا بہاؤ تیز تھا۔وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر برا حال کر لیا۔اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا ، شور سن کر دوڑا ہوا آیا۔بڑی مشکل سے بکری کو نکالا تب زہرہ کی جان میں جان آئی۔ نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔" (۲۴)

آج نو جوان لڑکا نجمہ کی باتیں کم بتاتا ہے، کیوں کہ اس کے سامنے نجمہ موجود ہے اور اب نسرین، نجمہ کا ہی رول ادا کر رہی ہے۔ دیہات اور بہن کی کہانیاں غیروں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی ہیں۔لیکن نسرین ان تمام باتوں کو اپنے سسرال کے واقعات کی طرح محسوس کرتی ہے۔جب دونوں بازار میں خریداری کے لئے گئے ہیں تو لڑکا اسے ہجوم کی دھکم پیل سے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور نسرین بھی ایک شریف اور گھریلو عورت کی طرح روز مرہ کی چیزیں ہی خرید لیتی ہے۔مگر اختتام کے نزدیک پہنچ کر افسانہ نگار کہانی میں ایک کلا عکس (Climax) پیدا کرتے ہیں:

"نسرین، میں نے تمہیں نجی کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔" نوجوان نے یہ بات ایسے گمبھر لہجے میں کہی تھی کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی:

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ لمحے خاموش رہا اور پھر بولا:

وہ یہ کہ وہ باوفا نہیں تھی۔

"کیا مطلب؟ نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔

"جھوٹ ہے۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا کوئی ثبوت بھی تھا۔" "وہ کیا؟"

نوجوان لمحہ بھر خاموش رہا۔پھر بولا:

اس کے خط۔میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔" یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن جھکالی۔

اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟"

"ہاں بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا۔" اس کے سوا چارہ

...... ہی نہ تھا۔"

کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے راز سے واقف ہو؟ بالآخر نسرین نے پوچھا۔نہیں، میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت نزع میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی اور ہے۔مگر میں اس سے آنکھ نہ ملا تا تھا۔البتہ دلداری اور تشفی کے کلمے برابر میرے منہ سے نکلتے رہے۔یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہوگئی۔" کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نو جوان ہی نے تو ڑا:
"آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا !"(۲۵)

اس سین میں قارئیں کو نو جوان کے تحت الشعور کے پوشیدہ راز سے انکشاف کیا گیا ہے۔دراصل اس نے محض نسرین کی ظاہری شکل وصورت میں اپنی زوجہ کے اوصاف ومحاسن نہیں دیکھے ہیں، بلکہ اس کی پیشہ وارانہ خاصیت یعنی طوائف کی بے وفائی و بد عہدی لڑکے کے دل کو نسرین کے کو ٹھے تک کھینچ لائی ہے۔نجمہ کا غائبانہ طور پر کسی عاشق کے ساتھ راہ و رسم تھی۔وہ شریف بیوی کا نقاب پہن کر برابر اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی اور دغا بازی برتی رہی تھی۔نیز لڑ کا صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنی بیوی کے آخری وقت تک شوہر کا رول ادا کرتا رہا تھا۔غلام عباس نے نسرین کے کردار کے ساتھ ان دونوں کی شخصیات کو متوازی طور پر پیش کر کے زندگی کو ایک پر پیچ و پراسرار معمے کے روپ میں دکھایا ہے۔یقینا لڑکا اور نجمہ دونوں کے رول کی ادائیگی ان کے گھر یلو اور سماجی شعور کی پروردہ ہے۔جب کہ ایک طوائف ہونے کے باوجودلڑکے سے ملاقات ہونے سے نسرین کی ذات اپنی محدود سوسائٹی کی اقدار کوتو ڑ کر اپنی اصلیت سے آشکار ہو جاتی ہے اور وہ خود وارفتگی وانکشاف کی کیفیت سے دو چار ہو جاتی ہے۔

غلام عباس اپنے افسانے " بہروپیا میں انسان کے معاشرتی شعوروں کی تہ داری کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک انسان اپنے معاشی و اقتصادی ناچاری و مجبوری کی وجہ سے بیک وقت سماج میں مختلف نقاب پہن کر زندگی گزارتا ہے۔افسانہ " بہروپیا محض ایک کہانی ہونے کے باوجود انسان کے سماجی شعور کے تنوعات اور بو قلمونی کی کیفیتوں کو عریاں کرتا ہے۔بہروپیا قلیل سے قلیل صلے کے حصول کے لئے آئے دن اپنا سوانگ بھرتا رہتا ہے۔مگر قدامت پسندانہ معاشرے کے تنزل وخاتمہ اور مغرب کے نئے اقتصادی نظام کی آمد کے اثرات اس کی زندگی میں کئی انقلابی پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔بہروپیا کی بستی کے خستہ حال و بوسیدہ مناظر ، اقتصادی و معاشی قدروں کے تغیرات کو علامتاً ظاہر کر دیتے ہیں۔چنانچہ اسی افسانے میں ایک غریب و نادار بہروپیا بھی اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھرنے کے لئے اپنے ہنر کو نئی سماجی قدروں کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔وہ ہر فن مولا ہونے کی بدولت ہر طرح کے کاموں کو نہایت سلیقے سے نپٹا دیتا ہے

"ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہوگا کہ ٹاٹ کا پردہ پھر سر کا اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے پٹیاں جمائے ،سر پر دو پلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھے جھونپڑے سے باہر نکلا، بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں اور ان کے بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔یہ وہی ہے۔" یکبارگی مدن چلا اٹھا۔" وہی قد ، وہی ڈیل ڈول۔" اور جب ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو اس کی چال بھی ویسی ہی تھی جیسی مہاجن کا پیچھا کرنے میں ہم نے مشاہدہ کی تھی۔میں اور مدن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔اب کے اس نے یہ کیسا روپ بھرا؟ اس وقت وہ کن لوگوں کو اپنے بہروپ کا کمال دکھانے جا رہا ہے؟ وہ شخص کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوبارہ شہر کے اندر پہنچ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2, 2024

گیا۔ہم بدستور اس کے پیچھے لگے رہے۔وہ بازار میں چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ہم سمجھے کہ شاید پان کھانے رکا ہے۔مگر نہ تو اس نے جیب سے پیسے نکالے اور نہ پنواڑی نے اسے پان ہی بنا کے دیا، البتہ ان دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی جسے ہم نہیں سن سکے۔پھر ہم نے دیکھا کہ پنواڑی دکان سے اتر آیا اور بہر پیا اس کی جگہ گدی پر بیٹھ گیا۔

پنواڑی کے جانے کے بعد اس دکان پر کئی گاہک آئے جن کو اس نے سگریٹ کی ڈبیاں اور پان بنا بنا کے دیے۔وہ پان بڑی چابکدستی سے بناتا تھا جیسے یہ بھی کوئی فن ہو۔"(۲۶)

وہ کبھی گوالے کا، کبھی پنواڑے کا، کبھی کو چوان کا، اور کبھی صوفی درویش کا بہروپ بھر کر معاشرتی و معاشی نظام میں ایک باعمل فرد کے طور پر حصہ لیتا ہے۔وہ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ہے۔ چلنے کے لئے اپنے روپ کو رنگارنگ بنا دیتا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے سماجی رول کے تصور کے ذریعے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عموماً آدمی کسی دوسرے کو محض اس کے ایک ظاہری نقاب کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔مگر انسان کی اصلیت کسی ایک نقاب سے عیاں نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ انسان اپنی فطرت کو سماجی قدروں کے کئی تہ دار لباسوں میں پوشیدہ کرتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے اور اجتماعی زندگی کا شعور اس کی عریانیت کو منظر عام پر لانے سے ممنوع کر دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔غلام عباس افسانہ "کن رس"، مجموعہ زندگی، نقاب، چہرے"مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ص ۳۶۶ ۔۳۶۷
۲۔جمیل جالبی، ڈاکٹر، "غلام عباس"، مشمولہ معاصرِ ادب،(لاہور:۔، ۱۹۹۱ء)، ص۲۲۸
۳۔ غلام عباس، "بہروپیا"، مشمولہ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتبہ: طاہر منصور فارقی، (لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، ۲۰۰۸)، ص۱۷۱
۴۔غلام عباس، "چکر"، مشمولہ غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص۱۹۱
۵۔غلام عباس، "کتبہ"، مشمولہ غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص۸۶
۶۔غلام عباس، "کن رس"، مشمولہ غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص۱۵۱
۷۔غلام عباس، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون"، مشمولہ زندگی نقاب چہرہ (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۵ء)، ص۲۶۴
۸۔غلام عباس، "بردہ فروش"، مشمولہ غلام عباس کے بے مثال افسانے ص ۱۵۲
۹۔ایضا
۱۰۔غلام عباس افسانہ "بھنور" ،مجموعہ زندگی، نقاب، چہرے"،مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ص ۲۰۶ ۔۲۰۷
۱۱۔غلام عباس افسانہ سمجھوتہ مجموعہ " زندگی ، نقاب، چہرے، مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ص۱۳۴ ۱۳۵
۱۲۔ایضاً ص ۱۴۲_۱۴۳
۱۳۔غلام عباس افسانہ اوورکوٹ، مجموعہ زندگی ، نقاب، چہرے "مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ، ص ۱۷۷
۱۴۔ایضاً ،ص ۱۷۸-۱۷۹
۱۵۔ایضاً، ص ۱۸۰
۱۶۔ایضاً ،ص ۱۸۲-۱۸۳
۱۷۔ایضاً ص ۱۸۴

۱۸۔غلام عباس افسانہ اس کی بیوی مجموعہ ”زندگی ،نقاب، چہرے“،مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ص۱۸۹

۱۹۔ایضاً ص۱۹۰

۲۰۔ایضاً ص۱۹۱

۲۱۔ایضاً ص۱۹۱۔۹۲

۲۲۔ایضاً ص۱۹۲

۲۳۔ایضاً ص۱۹۵

۲۴۔ایضاً ص۱۹۶۔۱۹۷

۲۵۔ایضاً ص۱۹۹۔۲۰۰

۲۶۔غلام عباس،”بہروپیا“، مجموعہ،”زندگی،نقاب،چہرے، مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۸۴، ص۳۸۷